علامہ اقبالؔ کی اردو غزل پر غالبؔ کے اثرات

جمشیدہ جہاں آرا

اسسٹنٹ پروفیسر کلسٹر یونیورسٹی امر سنگھ کالج، سرینگر جموں وکشمیر، موبائل:9797925895

اقبالؔ نے غزل کی قدیم روایت کے صحت مند عناصر کو برقرار رکھتے ہوئے اردو غزل کو ایک نئی زندگی اور نئے معنٰی ومفہوم دیے۔ اقبالؔ کی کوششوں کی وجہ سے ہی اردو غزل کی پرانی تاثیر میں نئی جان اور تقدیر بدل ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ ان کی غزلوں پر غالبؔ کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ غالبؔ نے غزل کی دنیا بدل ڈالی۔ غالبؔ کے وقت تک اس کا دائرہ محدود تھا اور اس دائرے میں صرف اور صرف محبوب کے خدوخال کی کارفرمائی نظر آتی تھی۔ غالبؔ نے اس میں زندگی کا فلسفہ، فکر، تلاش وتجسس کے عناصر بھر دیے۔ غالبؔ نے جس فلسفہ کو غزل کے دو مصرعوں میں پیش کرنے کی کوشش کی اقبالؔ نے اسے کر کے دکھا دیا۔

علامہ اقبالؔ نے اپنے فلسفیانہ افکار کو غزل کی زبان میں تغزل کی چاشنی کے ساتھ بیان کیا۔ انھوں نے غزل میں وسعت بیان، گہری معنویت اور پیچیدہ مسائل کو پیش کر کے زندگی کے چھپے ہوئے اسرار سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اقبال نے رسمی اسلوب اور ہیئتی تجربہ کے باوجود بھی موضوعات کو بڑی چابک دستی سے پیش کیا۔ ہر قسم کے مضمون کو بڑی مہارت کے ساتھ غزل کی مروجہ ہیئت میں ڈھال دیا۔ تاریخی، اسلامی اور سماجی واقعات کو اپنی غزل کے محدود سانچے میں بھر دیا۔ اقبال ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے ہمعصروں میں ایک الگ، منفرد اور اچھوتی راہ تلاش کی اور ایک ایسا بلند وارفع مقام حاصل کیا جو آج تک کسی اور شاعر کو نصیب نہ ہوسکا۔ اقبال کے یہاں تلاش وتجسس کا رجحان زیادہ نمایاں ہے۔

ان کی غزلوں میں کہیں کہیں طنز کی ہلکی سی لہر بھی موجود ہے۔ ان کا پیغام ایک خاص نقطۂ نظر کے تابع ہے جس کی کرنیں اس کے رنگا رنگ موضوعات ہیں۔ ان کی غزلیں خطیبانہ نہیں بلکہ وہ پیغام سے بھری پڑی ہیں۔ یوروپ جا کر اقبال کو اپنے وطن کی یاد اور مسلمانوں کی زبوں حالی تڑپاتی رہی، مسلمانوں کا غم ستانے لگا۔ وطن اور ملّت اسلامیہ کی اسی فرقت نے اقبال کی عام لے کو نرم، مدھم اور دلگداز بنا دیا۔ اس دور کی غزلوں میں عشقیہ عناصر کے ساتھ ساتھ حکیمانہ اور مفکرانہ انداز بھی پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اس فلسفہ کو غزل کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جس کا چراغ غالب نے پہلے ہی روشن کیا۔ اس فکر وفلسفہ کی روشنی کو تیز کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ فلسفہ کو واضح کرنے کے لیے بے شمار صفحات کی ضرورت پڑتی ہے۔ اقبال نے اسے غزل کے دو مصرعوں میں بھر دیا، جو اقبال کا طرۂ امتیاز ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش ہیں:

راز ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو
کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

مدیر ''مخزن'' سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کر رہی ہیں قومیں، انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

گیا ہے تقلید کا زمانہ مجاز رختِ سفر اٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا

ان کی غزلیں فکر سے معمور ہیں۔ اقبال نے غزل کی پرانی علامتوں کو نیا مفہوم دیا اور پرانی تلمیحات سے کام لے کر اپنے عہد کے مسائل کی ترجمانی کی مگر غزل کی زبان اور نغمگی کو برقرار رکھا:

اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا
ناز بھی کر تو بہ اندازۂ رعنائی کر

پھر بادِ بہار آئی، اقبال غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو، گل ہے تو گلستاں ہو

اقبالؔ نے غالبؔ کی شاعری کا مطالعہ بڑی شدومد کے ساتھ کیا۔ انھوں نے اپنے ذہن کو غالبؔ کی شاعری کے لیے تیار کیا، کیونکہ غالبؔ کی شاعری بڑی حد تک فکر وفلسفہ کی شاعری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ رومی، نطشے اور برگسان کے بالمقابل اقبالؔ نے غالبؔ کا ذکر کہیں بھی تفصیل کے ساتھ نہیں کیا۔ تاہم دونوں کے کلام میں انداز فکر اور نظریۂ فن میں یک رنگی ہے۔ دونوں کے ہاں قریبی اور گہری مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ اگر جدید شاعری غالبؔ سے جانی جاتی ہے تو وہ صرف اقبال کے ہی توسط سے۔ غالبؔ نے شوقؔ اور آرزوؔ کے استعارے جگہ جگہ استعمال کیے اور اقبال کے ہاں بھی یہ استعارے جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔

جیسے غالبؔ کا ایک شعر:

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

غالبؔ

متاع بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

اقبالؔ

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں جدوجہد، تجسس، فکر، حرکت و عمل پر زور دیتے ہیں۔ دونوں زندگی کو قریب سے جاننے کی کوشش میں تھے۔ ان کے لیے زندگی ایک رواں دواں مظہر ہے۔ برگسان کی طرح اقبالؔ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ زندگی ایک سیلاب ہے۔ یہی تصور اقبال نے اپنی غزلوں میں پیش کیا۔ زندگی وہ سیلاب ہے جو یہ نہیں دیکھتی ہے کہ اس کے راستے میں حائل کون ہے۔ جو اپنے آپ سے بے خبر ہوتا ہے جو اپنی طاقت سے بے خبر ہے اس کو وہ اپنے بہاؤ میں لے ڈوبتی ہے مگر جو اپنی خودی کو استوار رکھتا ہے اور اپنی صلاحیتوں کو برائے کار لاتا ہے وہ اس سیلاب کو بھی قابو میں کر لیتا ہے۔ اسی کا نام اقبالؔ کے تصور میں خودی ہے:

اقبالؔ پر غالبؔ کے اثر کو شیخ عبدالقادر یوں بیان کرتے ہیں:

''غالبؔ اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں، اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبالؔ نام پایا۔''[1]

اقبالؔ نے غالبؔ سے معنوی طور پر استفادہ کیا ہے۔ عبدالقادر سروؔر لکھتے ہیں:

''اس کے بعد انھوں نے جو غزلیں لکھیں وہ لفظاً و معناً غالبؔ کی تقلید نہیں تو غالبؔ کے کلام سے متاثر ضرور ہیں۔ بہر حال اقبالؔ نے ارشد سے صوری تلمذ حاصل کیا، داغ سے تحریری اصلاح لی مگر غالبؔ سے معنوی استفادہ کیا اور یہ آخری اثر ان کی طبیعت کے مناسب تھا۔ اس لیے وہ دیرپا ہے اور اب تک کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔''[2]

اقبالؔ نے اپنی غزل میں جگہ جگہ اس بات پر زور دیا ہے کہ زندگی بدلتی رہتی ہے۔ اقبال کے غم میں نیا انداز، تنوع اور تازگی و شگفتگی ہے۔ اقبالؔ نے معنوی طور پر غالبؔ کا ہر ایک تصور قبول کیا ہے۔ یہ صحیح بات ہے کہ اقبالؔ نے کھل کر غالبؔ کی تقلید نہیں کی بلکہ معنوی طور اقبالؔ نے غالبؔ کے بہت سے اثرات کو قبول کیا۔

اقبالؔ کی آخری غزل ۱۹۰۷ء کی ہے، جس کے چند اشعار یوں ہیں:

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا، راز اب آشکار ہوگا
دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

اقبالؔ کی یہ غزل نئے موڑ کا پتہ دیتی ہے۔ یہ غزل مکمل فکر کی عکاسی کرتی ہے۔ اقبال کے ہاں رسمی غزل کے خلاف ردِ عمل ابتدائی زمانے سے ہی دکھائی دیتا ہے مگر اس غزل نے رسمی بندشوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کامیاب کوشش کی۔

انور سدیدؔ اقبالؔ کی غزل کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اقبال نے غزل کی ہیئت کو رسمی پابندیوں کے ساتھ قبول کیا ہے، لیکن روایتی موضوعات اب اس کے فکر کی گردِ راہ بن چکے ہیں اور اقبال اس دھول کو بہت پیچھے چھوڑ چکا ہے۔ یعنی اقبال فنی طور پر پابہ گل ہونے کے باوجود فکری لحاظ سے اب آزاد فضاؤں میں اونچی پرواز کی طرف مائل ہے اور یہاں صرف اس کا لہجہ ہی بدلا ہوا نظر نہیں آتا بلکہ اس کی غزل کا ذائقہ بھی دوسروں سے مختلف ہے جو نئے ذہن کو بھی متاثر کر رہا ہے۔''[3]

اقبالؔ کی غزلوں کے بارے میں سید وقار عظیم یوں رقم طراز ہیں:

''دوسرے دور میں جس طرح فکر، تخیل اور احساس پر شاعری کی گرفت نسبتاً زیادہ مضبوط ہوتی ہے، اسی طرح غزل کے لوازمات اور تغزل کی کیفیات نے بھی زیادہ پختگی حاصل کی ہے اور جو چیزیں پہلے حد سے زیادہ بکھری ہوئی تھیں، وہ اب خود بخود ایک دوسرے سے قریب آتی اور ایک دوسرے میں جذب ہوتی معلوم ہوتی ہیں۔''[4]

اقبالؔ کی غزل سے اس بات کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ مغرب پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ وہ مشرقیت کے دلدادہ تھے اور مغربی زندگی کے بہت حد تک مخالف تھے۔ اقبال کی غزلوں سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے غزل کو حسن و عشق کے لیے ہی نہیں بلکہ دوسرے موضوعات کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ اقبال اپنی غزلوں میں حسن و عشق کا نغمہ گانے کے بجائے زندگی کا پیغام دیتے ہیں۔ اس غزل میں اقبالؔ کے افکار و نظریات پوری طرح واضح ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اقبال کی غزل میں مقصدیت غالب ہے تاہم یہ مقصدیت شعری محاسن کو اس طرح آراستہ و پیراستہ کرتی ہے کہ وہ اس مقصدیت کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔

اقبال نے غزل کے تمام آداب و روایات کی پابندی برقرار رکھی۔ ان کی

غزلوں سے غزل کا میدان اور زیادہ وسیع ہو گیا۔ اس میں نئے نئے موضوعات نے جگہ لے لی۔ غزل تغزل کے رنگ میں ڈھلنے لگی۔ اقبال نے اپنی بصیرت اور غزل کی بصیرت کو وسیع کیا اور نئی راہیں تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی:

کبھی اے حقیقتِ منتظر، نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

عزت ہے محبت کی قائم، اے قیس! حجابِ محمل سے
محمل جو گیا، عزت بھی گئی، غیرت بھی گئی لیلیٰ بھی گئی

مندرجہ بالا اشعار سے اقبال نے ثابت کیا کہ اردو غزل اب ان روایتی بندشوں میں قید نہیں، اسے انھوں نے روایتی بندشوں سے آزاد کیا۔ اب اردو غزل داخلی کیفیات کے ساتھ خارجی حالات کے ردِعمل کو اثر آفرینی کے ساتھ پیش کرنے کے قابل ہوگئی۔ تسلسل غزل کے لیے عیب سمجھا جاتا تھا مگر اقبال نے اپنے شعری حسن سے اس تسلسل کو بھی دوبالا کر دیا، جو صرف اور صرف اقبال کا ہی طرۂ امتیاز ہے۔ انھوں نے غزل میں عاشقانہ اشعار نہ کہے مگر لہجہ کی نغمگی اور انداز بیان کی دلکشی کی بنا پر ان کی غزلیں تغزل کا معیاری نمونہ بن گئیں۔ اقبال نے اپنی غزلوں میں جو موضوعات پیش کئے ہیں، غزل میں پہلے کم برتے گئے تھے، لیکن اقبال نے ان کو غزل کا ایک جز بنا دیا، یہی اقبال کا کمال ہے۔

انھوں نے غزل میں ہر طرح کے جذبات کی ترجمانی کی اور مربوط انداز میں فکر کو پیش کیا۔ غزل صرف عشقیہ جذبات کے لیے مخصوص ہے۔ اس کو غالب اور دوسرے بلند پایہ شعرا جیسے اقبال نے غلط ثابت کر دیا۔ اقبال نے غزل کے محدود دائرہ کو وسیع کیا اور غزل کی زبان کو مزید نکھارنے کی کوشش کی۔ انھوں نے غزل میں نئے افکار و خیالات کی ترجمانی کر کے غزل کو وسعت دی اور اس کو بلندی تک پہنچا دیا۔

غالب کا جہاں تک تعلق ہے اقبال غالب کے تخیل کی بلندی کے معترف ہیں۔ ''بانگ درا'' میں ''مرزا غالب'' کے عنوان سے اقبال نے جو غزل لکھی ہے، وہ غالب کی عظمت کے اس اعتراف کا ثبوت پیش کرتی ہے جس کا اظہار اقبال نے مذکورہ نظم میں کیا ہے۔ اقبال نے غالب کی اردو اور فارسی شاعری دونوں سے اثرات قبول کئے ہیں۔ غالب بھی ان چند مشہور شخصیات میں سے ہیں جنھیں علاّمہ اقبال نے اپنی زندگی کے ہر دور میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اقبال نے سب سے پہلے ۱۹۰۱ء میں غالب پر نظم لکھ کر انھیں خراجِ تحسین پیش کر کے ان کے اثرات کا کھلا ثبوت پیش کیا ہے۔ یہ وہ نظم ہے جو غالب پر پُرتاثیر مرثیہ ہے۔

غالب منفرد شاعر ہے جس کا ذکر اقبال کی ہر دور کی تحریر میں کسی نہ کسی صورت میں اور کسی نہ کسی خیال میں موجود ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی قربت غالب سے کتنی اہم اور مضبوط تھی۔ ''مرثیہ داغ'' میں بھی اقبال نے غالب کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ (عظمتِ غالب ہے اک مدت سے پیوندِ زمین)۔ اقبال جب کوئی تصور پیش کرتے تھے اس کی سند میں بھی کبھی کبھی غالب کا ہی شعر مرقوم فرماتے تھے۔

پروفیسر سید عبداللہ دو بڑے شعرا ''غالب اور اقبال'' کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''دونوں ذولسان شاعر ہیں اور زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ دونوں نے یہ میزانِ تخلیق بھی قائم کیا ہے کہ اردو میں اسی ادیب کو عظمت ملے گی جو فارسی و عربی زبانوں کا مزاج داں ہوگا۔ یہ وہ پیمانہ ہے جس پر فن کی بقا کا انحصار ہوگا۔ غالباً یہی اسباب ہیں جو اقبال کو غالب کے قریب کرتے ہیں۔''[۵]

ابتدائی شاعری سے لے کر ایامِ عروج کی شاعری تک اقبال کی غالب سے ذہنی مناسبت بڑی معنٰی آفرین ہے۔ یہ عقیدت آغاز سے آخر تک قائم رہی۔ ۱۹۰۰ء کی ایک مشہور نظم ''ابر گہربار'' جس کا شعر:

تیری الفت کی اگر ہو نہ حرارت دل میں
''آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا''

اس شعر کا دوسرا مصرع معنٰی و مفہوم اور ظاہری ہیئت کے لحاظ سے غالب کا ہے۔ اقبال نے غالب سے فکر کی عظمت، تفکر، فلسفہ، تخیل کی بلند پروازی، گہرائی، وسیع نظریہ جیسے تصورات کو قبول کیا ہے۔ ان اثرات کو قبول کرنے کے بعد اقبال ہر دور میں غالب سے قریب تر ہوتے گئے اور حالی کے بعد اقبال نے ہی غالب شناسی کی راہیں نکالیں۔ غالب کے فکر و فلسفہ کو اقبال نے ہی واضح شکل میں پیش کیا۔ انھوں نے غالب کے اثرات کو اس قدر تحلیل کیا کہ بقول شیخ عبدالقادر ''اقبال کے روپ میں غالب نے دوبارہ جنم لیا۔''

حواشی

۱۔ شیخ عبدالقادر، دیباچہ بانگ درا کلیات اقبال اردو، علامہ اقبال (لاہور اردو بازار: مکتب جمال ۲۰۰۵ء) ص: ۱۳

۲۔ عبدالقادر سرور، آثار اقبال (حیدر آباد دکن: ادارہ اشاعت غلام دستگیر رشید ۱۹۴۴ء) ص: ۱۲۲

۳۔ انور سدید، اقبال کے کلاسیکی نقوش، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع ثانی ۱۹۸۸ء) ص: ۶۱۷

۴۔ سید قادر عظیم، اقبال کی نظموں میں رنگ تغزل (اقبال مجلّہ بزم اقبال ۱۹۵۳ء) جلد شمارہ: ۴، ص: ۱۰۷

۵۔ پروفیسر عبداللہ ''اقبال اور اقبالیات'' (میزان پبلشرز: ۲۰۰۹ء) ص: ۷۰۔۷۱

◆◆◆